عصرِ حاضر میں علماء کا کردار

مولانا محمد عیسیٰ منصوری (لندن)

واقعہ یہ ہے کہ سماج وسوسائٹی میں علماء کرام پر حضرات انبیاء کے وارث ہونے کی حیثیت سے سب سے زیادہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے مگر عرصہ دراز سے ہمارے علماء کرام جس نصابِ تعلیم اور جس ماحول میں نشوونما پا رہے ہیں۔ اس طرح کی کوئی تحریک جس میں بڑی حکمت ودانش، صبر وتحمل اور ایثار وقربانی کی ضرورت ہے، کم ازکم موجودہ علماء کے بس کی بات دکھائی نہیں دیتی۔ عرصہ سے ہمارے علماء نے جس طرح مایوس کیا ہے۔ بندہ کے نزدیک یہ زوال وگراوٹ کی انتہا ہے۔

علماء کا نقطۂ عروج حضرت شیخ الہند تک تھا جب حضرت شیخ الہند مالٹا سے واپس لوٹے تو دنیا نے دیکھا کہ کانگریس اور مہاتما گاندھی نے انھیں اپنا رہنما وقائد کہا بلکہ شیخ الہند کا لفظ غالباً گاندھی نے سب سے پہلے استعمال کیا اور برصغیر کے مقتدر مسلم رہنماؤں ڈاکٹر انصاری، مولانا محمد علی جوہر وغیرہ وغیرہ نے اپنا قائد رہنما اور لیڈر تسلیم کیا۔ حضرت شیخ الہند نے قدیم وجدید طبقہ کے مابین دوری وفاصلے اس طرح ختم کیے کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں فرمایا ''میں جن لوگوں کو خانقاہوں اور مدرسوں میں ڈھونڈتا تھا، وہ مجھے یہاں ملے'' اور فرمایا ''آج میں نے دیوبند کا رشتہ علی گڑھ سے جوڑ کر ایک نئی تاریخ کی بنیاد رکھ دی ہے۔'' یاد رہے کہ آج بھارت کے مسلمانوں کی دوسری بڑی یونیورسٹی جامعہ ملیہ دہلی کی بنیاد بھی حضرت شیخ الہند کے مبارک ہاتھوں سے رکھی گئی۔ اس وقت برصغیر میں حضرت شیخ الہند کی سطح کا کوئی لیڈر ورہنما نہیں تھا۔ کانگریس حتیٰ کہ کمیونسٹوں تک نے حضرت شیخ الہند کے مقام کو تسلیم کیا۔

حضرت شیخ الہند کی فکر نہ کسی خطہ تک محدود تھی نہ کسی خاص مسئلہ تک ان کے سامنے پورے برصغیر کی آزادی اور اس کے ضمن میں پوری مسلم دنیا کی آزادی اور تعمیر وترقی تھی۔ آپ کی برپا کردہ تحریک کا دائرہ جرمنی، ترکی، افغانستان تک وسیع تھا اور لازماً اس کے اثرات بیشتر مسلم ممالک تک پھیلے ہوئے تھے۔ حضرت کی آنکھ بند ہونے کے بعد علماء کی سوچ صرف برصغیر، اس کے بعد برصغیر کے دو پھر تین ٹکڑے ہونے کے بعد اپنے ٹکڑے تک سکڑ کر رہ گئی۔ آہستہ آہستہ اجتماعی مسائل کی فکر اور جہد اور باتیں صرف مخصوص حلقوں تک محدود ہوئیں۔ اب یہ فکر اور تذکرے بھی ناپید ہیں۔ آپ کسی بڑے سے بڑے ادارے میں چلے جائیں یا تو سیاست حاضرہ پر رواں تبصرے ملیں گے یا ادارہ ومدرسہ کے انتظامی معاملات پر گفتگو۔ ملت اور انسانیت کو درپیش اجتماعی (سیاسی، معاشی، معاشرتی، تعلیمی، تربیتی) مسائل پر فکرمندی تگ ودو اور منصوبہ

بندی کی سوچ وفکر کہیں نظر نہیں آئے گی۔ ایک طرف اقوام عالم عالمگیریت کی طرف رواں دواں ہے۔ دوسری طرف ہماری سوچ اپنے ادارے تک سکڑ کر رہ گئی۔ ایسا لگتا ہے ہم وقت کے تقاضوں سے آنکھیں بند کر کے دوبارہ قبائلی دور کی طرف واپس لوٹ گئے ہیں۔ اب ساری سوچ و جہد اپنا ادارہ چلانے اور اس کے لیے وسائل جمع کرنے پر ہے۔ اداروں میں بھی مکتبی مولویوں کا ڈھیر لگا رہے ہیں۔ معاف کیجیے ہم لوگ دینی تعلیم کے نام پر ایک ایسا پیشہ ور طبقہ پیدا کر رہے ہیں، جن کا مطمح نظر صرف اپنا پیٹ اور ضروریات و آسائش ہو۔ بالائی ومقتدر طبقہ اسلامی وڈیرہ بنتا جا رہا ہے۔ سادگی، جفاکشی، زہد وقناعت قصۂ پارینہ بنتا جا رہا ہے۔ غرض ہماری نئی نسل نے گزشتہ ۳۰، ۴۰ سال سے جس ماحول میں نشوونما پائی ہے۔ اس سے آپ کیا توقع رکھ سکتے ہیں جب تک اصل ہدف ومقصدِ حیات جو حضراتِ انبیاء کا مقصدِ حیات تھا یعنی دعوت و جہد، دین کا پھیلانا اور اس کے لیے ہر قسم کی قربانی کے ماحول میں نئی نسل کو لا کر از سرِ نو تربیت و ذہن سازی نہیں کی جائے گی۔ ان حالات میں اگر کوئی ملک گیر سماجی تحریک شروع کی گئی تو اندیشہ ہے کہ وہ تحریک اقتدار و جاہ کے لیے سر پھٹول کی تحریک نہ بن جائے۔ اس سے علماء کرام کا رہا سہا بھرم بھی جاتا رہے۔ علماء کرام کو اپنے اصل کام کی طرف واپس آنا ہوگا۔ خواہ اس کی ابتداء آج کریں خواہ نصف صدی انتظار کے بعد۔ کیونکہ اس کے بغیر مغرب کی ہمہ جہت یلغار سے نہ قوم بچے گی، نہ ملک، نہ دینی ادارے، نہ خود ہم۔

کچھ عرصہ قبل ایک دینی رسالے میں اپنے ایک مضمون میں حسن الامین صاحب نے جس مسئلہ پر بطور خاص زور دیا ہے، وہ ہے دینی طبقات پر سے دہشت گردی وعسکریت پسندی کا لیبل مٹانا۔ یہ لیبل تو عالمی طاقتوں نے انسانیت اور اقوام عالم پر اپنے خونیں پنجے گاڑنے کے پروگرام سے توجہ ہٹانے کے لیے چسپاں کیا ہے۔ دعوت الی اللہ اور انسانیت تک خدا کا پیغام پہنچانے کے عملی کام کے بغیر ہماری توبہ تلہ اور برأت ظاہر کرنے سے ذرہ برابر فرق نہیں پڑنے والا۔ دوسرے اب تک ہمارے علماء کرام تو یہ بھی طے نہیں کر پائے کہ لوگوں کے اذہان وقلوب تک رسائی کے لیے جدید ذرائع ابلاغ کے استعمال کا جواز بھی ہے یا نہیں۔ شاید اس پر بحث ومباحثہ کے لیے انھیں مزید نصف صدی درکار ہے۔ ان حالات میں اگر علماء دن بدن بے اثر و بے حیثیت ہوتے جا رہے ہیں تو میرا خیال ہے اس کے لیے کسی سماجی علماء تحریک کے بجائے اپنے اصل مقصد کی طرف لوٹنے اور نظام تعلیم وتربیت پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

دوسرا اہم مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے علماء کرام کو عصر حاضر (جس میں مغرب نے دنیا پر ہمہ جہتی غلبہ پا لیا ہے) میں ملت کے مختلف طبقات بشمول علماء، تاجروں، سیاست دانوں، وکلاء کی عملی دشواریوں کا نہ علم ہے نہ سمجھنے کی کوشش۔ ہم اپنے گوشوں میں بیٹھ کر جو فتاویٰ دے رہے ہیں، امت کے طبقات اپنے آپ کو اس کا مخاطب ہی نہیں سمجھتے بلکہ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ (وعظ وفتاویٰ) تو مولویوں کا کام ہے۔ ہم بے نیاز ہو کر اپنا کام کیے جائیں۔ عوام اور ان کے مسائل سے ہماری لاتعلقی کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ایک مفتی وفقیہہ کا ذہن ومزاج تیسر وتوسع کا ہونا چاہیے۔ یعنی شرعی حدود میں رہتے ہوئے عوام الناس کو

جس قدر بھی سہولت و آسانی فراہم کی جا سکے اور ان کے لیے گنجائش نکالی جا سکے۔ البتہ صوفیاء کا مزاج و ذہن حتیٰ الامکان تقویٰ و احتیاط کا ہونا ہے۔ مشکل یہاں پیش آتی ہے کہ مزاجاً تو ہیں صوفی اور بن بیٹھے مفتی اس لیے اکثر فتاویٰ فضاء میں معلق رہتے ہیں اور عوام کا یہ ذہن بنتا جا رہا ہے کہ اسلام کے احکامات پر عمل پیرا ہونا بس خواص اور متقیوں کا کام ہے۔ انسان دین پر چلتا ہے۔ ماحول سے اور دینی ماحول بنانے کی جدوجہد ہم نے حضرت مہدی کے لیے چھوڑ رکھی ہے۔ شاید اسی لیے اس دور کے فقہاء نے جب وہ عملی میدان کی نزاکتوں کو سمجھتے تھے کہا ہے ''جو اپنے اہل زمانہ کو نہ سمجھے وہ جاہل ہے۔''

حال ہی میں پاکستان کا واقعہ ہے۔ ایک بڑے مفتی صاحب سے بھرے مجمع میں سوال کیا گیا۔ زکوٰۃ کی رقم ہسپتال کے مریضوں کے علاج معالجہ میں دینا جائز ہے؟ انھوں نے فرمایا کہ نہیں اس لیے کہ زکوٰۃ میں تملیک ضروری ہے اور ہسپتال ادارہ ہے۔ پھر انہی صاحب نے پوچھا زکوٰۃ کی رقم کسی مدرسہ میں دینا جائز ہے تو فرمایا ہاں بالکل جائز ہے تو سائل نے کہا مدرسہ بھی تو ایک ادارہ ہے۔ آپ میرے ساتھ چل کر دیکھیں۔ سرکاری ہسپتالوں میں غریبوں کی کیا درگت بنتی ہے۔ ان بے چاروں کے پاس نہ دوا کے پیسے ہوتے ہیں، نہ غذا کے اور آپ کے ادارہ میں چلیں۔ دوپہر میں طلباء پیٹ بھر کھا کر قیلولہ کر رہے ہوں گے اور پچاسوں کا کھانا ڈسٹ بن میں ضائع ہو رہا ہوگا تو مفتی صاحب نے فرمایا جب آپ کو ہم پر اعتماد نہیں تھا تو فتویٰ کیوں پوچھا۔

کسی جگہ ایک بزرگ صاحب علم کا ارشاد پڑھا تھا۔ فرمایا: ایک بار میرے جی میں آیا سب لوگ فضائل پر بیان کرتے ہیں، مسائل پر نہیں۔ اسی روز میں نے مسائل پر بیان کر دیا۔ اس پر وہ اختلافات، جھگڑے، مناظرہ بازی اور سر پھٹول ہوئی کہ الاماں۔ میں نے غور کیا تو پتا چلا غلطی میری تھی۔ میں نے مسئلہ کے لفظ پر غور نہیں کیا کہ مسئلہ سائل سے تعلق رکھتا ہے یعنی جب کوئی پوچھے تو جواب دیا جائے۔ اس دن سے میں نے اصول بنا لیا۔ اوّل تو بغیر پوچھے مسئلہ بتانا نہیں۔ دوسرے پوچھنے والے میں یہ دیکھنا کہ آیا اسے اس مسئلہ کی ضرورت ہے یا یوں ہی تفریح کے لیے آیا ہے۔

غرض علماء کرام کا پہلا اور بنیادی کام عوام میں دینی جدوجہد کے ذریعے دین پر چلنے کی استعداد پیدا کرنا ہے۔ اس کے بغیر اجتماعی معاملات میں داخل ہونا خود کو مزید بے قدر کرنا ہے۔ حضرت مولانا یوسف بنوری کا ایک خاص امتیاز یہ تھا کہ وہ امتِ مسلمہ کے درد و غم میں بعض ایسی باتیں فرما دیا کرتے تھے کہ عام علماء مصلحتاً زبان پر لانے کی جرأت نہ کر سکیں۔ مثلاً ایک بار آپ نے حضرت مفتی محمودؒ سے فرمایا: ہمیں سر جوڑ کر اس پر غور کرنا چاہیے کہ آیا میدانِ سیاست میں ہماری جدوجہد اصل مقصد (عوام میں دینداری پیدا کرنا) کے لیے مفید بھی رہی ہے یا نہیں؟ ایک بار لکھا جی چاہتا ہے کہ اہل مدارس سے کہوں سب ادارے (دارالعلوم) بند کر کے کچھ عرصہ کے لیے ہمیں عوام میں گھس کر ان میں دینی جدوجہد دعوت کے ذریعہ دین پر لانے کی سعی کرنی چاہیے۔　☆☆☆